تعارف وتبصرہ

"خضر راہ"

یہ معروف ادیب اور صحافی جناب قیوم خضر کی اس کتاب کا عنوان ہے جس میں انھوں نے اپنے الفاظ میں "اسلامی تصوف کا تجزیدی مطالعہ" کیا ہے۔ انھوں نے اس مطالعہ کی خود ہی یہ تشریح کی ہے کہ یہ فلسفۂ تصوف کے بجائے نفس تصوف کا مطالعہ ہے یعنی اس میں تصوف کی تعریف و توضیح کی گئی ہے اور اس کی حقیقت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب کے تین ابواب ہیں۔ اشارات، محاضرات، توضیحات۔ ان کے علاوہ ابتدا میں "معروضات" کے عنوان سے مقدمہ کتاب ہے اور "کتابیات" کے عنوان سے ماخذ مطالعہ کا تذکرہ خاتمۂ کتاب پر کیا گیا ہے۔ کتاب کے دو ابواب، محاضرات اور توضیحات، کو میں صرف تتمہ یا ضمیمہ سمجھتا ہوں، اس لئے کہ اول الذکر میں "روزہ اور اس کی حقیقت" پر گفت و گو کی گئی ہے، جو تصوف کی طریقت کے بجائے اصلاً و اصولاً دین کی شریعت کا ایک رکن ہے، اس طرح ثانی الذکر "مختصر قاموس تصوف" ہے، یعنی اس میں صرف الفاظ و اصطلاحات کی شرح ہے، جو لغت نویس کا کام ہے۔ لہٰذا کتاب کے موضوع پر بحث دراصل ایک ہی باب، اشارات، میں ختم ہو جاتی ہے۔ چناں چہ میرا تبصرہ اسی باب پر مبنی ہے۔

مصنف کی معروضات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف کی پرخطر نزاکتوں سے واقف ہیں، کہتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ تصوف میں بعض الفاظ جن معانی میں استعمال ہوتے ہیں عام طور پر لغت میں ان الفاظ کے معانی بعینہ اسی طرح نہیں

ملنے، کیوں کہ صوفیا الفاظ کے معانی اپنے احوال و کوائف کے مطابق لیا کرتے ہیں"۔ (ص۵)

مصنف صوفیا کے اس طرز گفت و گو کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:۔

"اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اہل تصوف کا تو مشن ہی یہ تھا کہ لوگوں کے اندر اس حقیقی دینداری اور خدا پرستی کی اصلی روح کو بیدار اور جاری و ساری کیا جائے جو انبیاء کی دعوت کا اصل مقصد تھا لیکن یہ بات ظالم و جابر بادشاہوں نیز حکمرانوں کو گوارہ نہ تھی، اس لئے صوفیا اپنی بات ایسی زبان اور اصطلاحات میں بیان کرتے تھے کہ ان کے اپنے طائفہ کے لوگ تو اچھی طرح سمجھ لیں لیکن اگر وہی باتیں ان کے حلقے سے باہر جائیں تو دوسرے اس سلسلے کے بھیدوں کو نہ پاسکیں"۔

میرے خیال میں یہی تصوف کی اصلی خامی ہے اور جو صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے وہ دین کی روح اور شریعت کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ انھوں نے طریقت کو خانقاہیت کے گورکھ دھندے میں گم کر دیا تھا۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا قول تو یہ ہے کہ "سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا" ہے، جب کہ یہ نام نہاد صوفیا اپنے خیال میں رشد و ہدایت کے ملفوظات گویا جابر بادشاہ کے خوف سے خفیہ طور پر بس اپنے حلقۂ خاص میں ارشاد کیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ صوفیا کہلانے والے تمام بزرگان دین کے بارے میں ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ وہ مبہم بیانات دیا کرتے تھے، اس لئے کہ جن حضرات کو صوفیا کہا جاتا ہے ان میں بعض بڑے بڑے علمائے اسلام شامل ہیں جنھوں نے اپنے دور میں خدا کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ جہاد کیا اور کبھی کسی جابر بادشاہ یا ظالم حکمراں کی انھوں نے پروا نہ کی۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہدانہ کارنامے اس سلسلے کی روشن مثال ہیں۔ شریعت دین کی علانیہ پابندی اور فرائض کی برملا ادائیگی چاہتی ہے، لہٰذا جو طریقت اس تقاضے

شریعت کے خلاف ہو وہ اسلام کے صراط مستقیم سے ہٹی ہوئی ہے۔

اس نکتہ پر زیر نظر کتاب کے باب اول "اسلامی تصوف کا تجریدی مطالعہ" بہ عنوان "اشارات" کی ابتداہی میں شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول سے کافی روشنی پڑتی ہے:

"قیامت کے دن تم سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ "فتوحات مکیہ" پڑھی تھی یا نہیں، بلکہ وہاں تو یہی پوچھا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی یا نہیں"۔(صہ ۱۸)

قیوم خضر صاحب نے اس فکر انگیز قول پر تبصرہ کرتے ہوئے خود ہی لکھا ہے

"ان (شیخ محی الدین ابن عربی) کی نظر میں بھی تصوف کتاب وسنت کی پیروی کے ایک طریقے کا نام ہے"۔ (ایضاً)

میرے خیال میں یہی لفظ "طریقت" کی بہترین تشریح ہے کہ یہ بس "کتاب وسنت کی پیروی کے ایک طریقے کا نام ہے"۔ چناں چہ اگر تصوف کے کسی طریقے میں کتاب وسنت سے ذرا بھی تجاوز نظر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ غلط اور گم راہ کن ہے۔

اس سلسلے میں قیوم خضر صاحب نے حضرت داتا گنج بخش ؒ کا جو قول ان کی تصنیف "کشف المحجوب" سے نقل کیا ہے اس میں ایک جملہ بہت حقیقت افروز ہے

"اگر تصوف کے انکار سے تمہاری مراد محض اس کے نام سے انکار ہے تو کچھ حرج نہیں"۔ (صہ ۲۰)

لیکن موصوف کے ملفوظ کا یہ حصہ کہ "اگر (تصوف کے) معنی اور حقیقت سے انکار کرتے ہو تو سمجھ لو کہ یہ کل شریعت سے انکار ہے" محل نظر ہے، اس لئے کہ اس میں بے جا مبالغہ آرائی ہے اور تصوف کو بلا وجہ روح مذہب کا مترادف تصور کرلیا گیا ہے۔ جو بات حضرت داتا گنج بخش ؒ اپنے خیال میں تصوف کے معنی اور حقیقت کے بارے میں کہنا چاہتے ہیں وہ صرف شریعت کے لئے مخصوص ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اپنے دین کو شرع اور شریعت تو کہا ہے، طریقت یا تصوف نہیں کہا ہے، لہٰذا تصوف کے لفظ ومعنی پر اس درجہ اصرار کہ اس کا انکار "کل شریعت کا انکار" ہے بالکل غلط اور لغو ہے۔

اس معاملے میں حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول فیصل ارشاد کیا ہے، جو صفحہ ۵۲ پر زیر نظر کتاب میں مندرج ہے:

"کتاب وسنت کو اپنے سامنے رکھو، تامل وتدبر کے ساتھ دونوں کا مطالعہ کرو اور ان دونوں ہی کو اپنا دستور العمل بناؤ..... خاتم المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارا کوئی نبی وہادی نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں اور قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں کہ ہم اس پر عمل کریں لہذا تم ان دونوں کے دائرے سے باہر نہ نکلو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے، تمہاری خواہش اور شیطانی وسوسے تمہیں گمراہ کر دیں گے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ تم اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے، اس لئے سلامتی کتاب وسنت کی پیروی ہی میں ہے اور ہلاکت ان کی عدم پیروی میں۔"

اس قول فیصل کے بالکل برخلاف شاہ تصدق علی صاحب کی وہ خرافات ہے جو قیوم خضر صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۹ پر نقل کی ہے۔ اس لغو بیان کے یہ گمراہ کن جملے دیکھئے:

"شریعت کثرت خلق ہے اور خلق کو فنا ہے، حقیقت وحدت ہے اور وحدت عین حق ہے نیز حق کو بقا ہے۔ اس صورت میں اہل شریعت رو بہ خلق ہیں اور اہل حقیقت رو بہ حق ہیں، سوچئے کہ رو بہ حق ہونا اچھا ہے یا رو بہ خلق ہونا بہتر ہے۔"

اس لایعنی ملفوظ کی انتہائے جسارت یہ ہے کہ

"حضور سرور کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت میں نبی اور حقیقت میں ولی تھے۔"

نعوذ باللہ! گویا شاہ تصدق علی صاحب کے خیال میں "ولی" نبی سے بڑا ہے، جس شخص نے بھی قرآن سمجھ کر پڑھا ہے جانتا ہے کہ ولی ہر وہ شخص ہے جو خدا اور رسول کے

احکام وارشادات کی پوری پابندی وپیروی اپنے قول وعمل دونوں سے کرے، جب کہ نبی صرف وہ چند شخصیتیں ہیں جنھیں اللہ نے اپنی پیغام بری کے عظیم منصب پر فائز کیا اس لئے نبی کی امت ہوتی ہے جس میں نبی کے پیروؤں کے درمیان وہ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نبی کی پیروی میں پختگی کے باعث ولی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

علم وعمل کی بحث میں حضرت مخدوم جہاںؒ کا یہ قول بالکل صحیح ہے ایمان افروز ہے کہ "علم امام ہے عمل کا اور عمل اس کے تابع ہے" (مکتوب ۳۷، منقول "خضرراہ"، صـ۳۱) لیکن حضرت کا یہ ملفوظ ناقابل فہم ہے کہ "جو علم زندگی کے چشموں سے ابلتا ہے اس کو ظاہری حواس کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی"۔ (مکتوب ۴۱، منقول خضرراہ صـ۳۲)۔

قیوم خضر صاحب نے سماع کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے ان کی کوشش اعتدال کے باوجود محل نظر ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے شاہ اختر حسین چشتی صابری صاحب کی جو خرافات سماع کی تصدیق وتشریح میں درج کی ہے وہ بڑی عبرت انگیز ہے۔ ایسی ہی مغالطہ بازیاں سماع کو ایک خطرناک لغویت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اچھے اشعار اور اچھی آواز یقیناً جاں فزا ہیں مگر سماع کے نام سے قوالی اور حال قال کا جو ہنگامۂ رقص وموسیقی گرم کیا جاتا ہے اس کا کوئی جواز شریعت میں نہیں ہے۔ یہ محض چند اہل دل کہلانے والوں کی تفریح اور نشاط خاطر کا سامان ہے جسے خواہ مخواہ تقدس کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کار عبث ہے۔

"تصوف میں گوشہ نشینی اور بے عملی" پر گفت وگو کرتے ہوئے جناب قیوم خضر نے بالعموم اعتدال وتوازن سے کام لیا ہے اور چند بصیرت افروز حقائق پیش کئے ہیں، لیکن بعض خدا رسیدہ بزرگوں کے متعلق "ترک اسباب" (۴۲) کی جو بات انھوں نے کی ہے وہ خود ان کی دی ہوئی ان دلیلوں اور مثالوں کے خلاف ہے جو انھوں نے علمائے اسلام کی سیرتوں سے لی ہیں۔

"دعا وتعویذ کی حقیقت" اور "ضرورت شیخ" پر جو مباحث زیر نظر کتاب میں ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ مستقیم کی جستجو کے باوجود خطوط منحنی بار بار قدموں تلے آتے اور مسافر کو منزل سے بھٹکاتے یا الجھاتے ہیں۔ بات سیدھی اور صاف یہ ہے

کہ خدا کے سوا کسی بھی ہستی کو کسی بھی درجے میں کارساز تصور کرنا شرک کی حد تک پہنچ جاتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں واحد معصیت ہے جس کی مغفرت قیامت کے روز دادِ محشر کسی بھی حال میں نہ کرے گا، جیسا کہ اس نے بار بار قطعی طور پر قرآن حکیم میں واضح فرما دیا ہے۔ اسی طرح دعا خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی متحمل نہیں، بندہ خدا ہی سے براہ راست مانگے گا تو کچھ پائے گا۔ دوسرے ادیان کے مقابلے میں اسلام کا یہی امتیاز ہے کہ اس میں پروہتوں کا کوئی نظام نہیں ہے، خالق و مخلوق کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں اور احکام شریعت میں رسول کی تقلید کے سوا کسی دوسری انسانی شخصیت کی بے چون وچرا پیروی کا پھندا آدمی کی گردن میں نہیں ڈالا گیا۔ علمائے اسلام سے استفادہ اور اولیاء اللہ سے محبت یقیناً ایک کارِ خیر ہے، مگر جو کچھ ہے دین و شریعت کے حدود میں اور خدا و رسول کے اتباع میں۔

مجموعی طور پر قیوم خضر صاحب نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے ایک نازک اور پیچیدہ موضوع پر بہت ہی دلچسپ، معلومات افزا اور فکر انگیز نکات ایک مختصر سی کتاب میں سلیقے کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں، جن کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جویائے حق ہیں اور انھوں نے حتی الوسع مذہبی امور میں غلو اور افراط و تفریط سے دامن بچا کر صحیح دینی و شرعی موقف اور نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سلسلے میں بہتیری غلط اور گمراہ کن باتوں کی تردید خود اکابر صوفیا کے اقوال کے حوالے سے کی ہے کہ اکابر صوفیا و اولیا اور بزرگان دین طریقت کو شریعت سے الگ نہ سمجھتے تھے بلکہ شریعت کے گہرے شعور اور اس کی پرخلوص پابندی کا ایک طریقہ، ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور جب تک دین و شریعت کا پختہ علم و عمل کسی شخص کو حاصل نہ ہوتا تھا اس کو نہ صوفی مانتے تھے نہ ولی نہ بزرگ۔ اس طرح بزرگانِ دین کے نزدیک طریقت تقویٰ، زہد اور "احسان" سے مختلف کوئی چیز نہ تھی اور اس میں نہ تو ترک دنیا کی گنجائش تھی، نہ بے عملی، بدعقیدگی اور بدعت کی۔ لیکن عالم و مجاہد اولیا کے جاہل و کاہل جانشینوں یا نقالوں نے اپنی بے شعوری اور بدکرداری سے تصوف کے نام پر سماج میں ضعیف الاعتقادی اور بدعملی

پھیلائی لہٰذا ضرورت ہے کہ حقیقی بزرگان دین، علما، صلحا، اولیا اور اتقیا کے مجاہدوں سے سبق حاصل کیا جائے اور ان کے نقالوں سے احتراز کیا جائے۔

یہ قیمتی نکات جناب قیوم خضر نے بڑے شگفتہ انداز سے بیان کئے ہیں، اگرچہ بعض جگہ شگفتگی شاعری کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ بہرحال بزرگوں کے اقوال اور قرآن و حدیث کے حوالوں سے کثرت کے باوجود بیان میں سلاست اور روانی عام طور سے پائی جاتی ہے۔ یہ خوبیاں کتاب کو دلچسپ اور ایک دقیق موضوع کو سہل بناتی ہیں، لیکن قرآن و حدیث کے بعض حوالوں کو بزرگوں کے ملفوظات سے نقل کرنے کے بجائے براہِ راست آیات و روایات سے لینا بہتر ہوتا، تاکہ وہ تسامحات سرزد نہ ہوتے جو کہیں کہیں نظر آتے ہیں، مثلاً صد۹ پر آیت قرآنی کا ایک حوالہ جو درحقیقت آیت نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ "خضرِ راہ" تصوف کا ایک اچھا، نسبتہً و عموماً محتاج اور مفید مطالعہ ہے۔ تصوف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس میں کافی فکرانگیز مواد ہے، ایسی کتاب کو ہر کتب خانے کی زینت بننا چاہیے۔

(ڈاکٹر عبدالمغنی)

ھندوستان پبلی کیشنز کی اھم مطبوعات

۱۔ اسلام۔ ایک روشن حقیقت	ڈاکٹر محمودہ عبدالعاطی	۲۵/-
۲۔ اخوان المسلمون کا تربیتی نظام	یوسف القرضاوی	۸/-
۳۔ ہم دعوت کا کام کیسے کریں	عبدالبدیع صقر	۸/-
۴۔ اسلامی معیشت کے بنیادی اصول	محمد ابوالسعود	۱۰/-
۵۔ دعوت اسلامی پندرہویں صدی کے استقبال میں	الغزالی	۲۰/-
۶۔ اسلامی کردار	محمد الغزالی	۲۰/-
۷۔ زنداں کے شب و روز	زینب الغزالی	۱۲/-

ملنے کے پتے
۱۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ۱۳۵۳۔ چتلی قبر۔ دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶
۲۔ کریسینٹ پبلشنگ کمپنی ۔ ۲۵-۲۰۳۴۔ بلیماران گلی قاسم جان"

جواب آں استدراک

تحقیقات اسلامی (جلد ۲، شمارہ ۱ جنوری۔مارچ ۸۳ء) میں نیاز اگیں کے مقالہ "عہد نبوی کی مسلم معیشت میں اموال غنیمت کا تناسب" پر اپنے محترم دوست جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا استدراک پڑھا۔ خوشی ہوئی کہ مضمون نے اہل علم کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ مزید مسرت اس امر کی ہوئی کہ فضلائے کرام کے تنقیدی شعور کو بیدار کرنے اور علمی ردعمل پیدا کرنے کا موجب بھی ہوا۔ استدراک پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے دوران میرا یہ خیال تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق میری کسی دانستہ یا نادانستہ غلط بیانی پر مجھے تنبیہ بھی ہوگی اور اس کے سبب قارئین گرامی کے ذہن میں جو شکوک و شبہات یا اعتراضات نفس موضوع کے بارے میں پیدا ہوں گے ان کا ازالہ ہو جائے گا اور وہ موضوع زیر بحث کو اس کے صحیح پس منظر اور اصل تناظر میں دیکھ سکیں گے۔ لیکن افسوس کہ اس کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ فاضل تنقید نگار نے "ریاضی" اور ان کے اصولوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نہ صرف سررشتۂ معانی کھو دیا بلکہ "ریاضی کے لحاظ سے" جس "واضح بے احتیاطی" کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مضمون میں غالباً موجود نہیں ہے۔ میں ان مثالوں کی مختصر سی وضاحت کرنے کی اجازت چاہوں گا جو ناقد موصوف و محترم نے میرے مضمون سے پیش کی ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر صاحب نے غزوہ بدر میں حاصل شدہ مال غنیمت کے بارے میں دو اعتراضات کئے ہیں۔ اول یہ کہ روایت میں اس مال غنیمت میں ملنے والے اونٹوں کی تعداد ایک سو پچاس بتائی گئی اور مجاہدین بدر میں اس مال غنیمت کی تقسیم کے ضمن میں یہ کہا گیا کہ ان میں سے کچھ کو ایک اونٹ ملا تھا، کچھ کو دو اونٹ اور کچھ کو کھالیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ مجاہدین بدر کی تعداد تین سو تیرہ تھی لہٰذا اونٹوں کی تعداد تین سو تیرہ ہونی چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ مضمون یا تاریخی روایت میں یہ دعویٰ کب کیا گیا ہے کہ مجاہدین بدر میں سے ہر ایک کو کم از کم ایک اونٹ بطور مال غنیمت ملا تھا۔ مضمون میں واضح طور سے یہ حقیقت بیان کر دی گئی ہے کہ چونکہ اونٹوں کی تعداد مجاہدین کی تعداد سے کم تھی اس لئے کچھ کے حصے میں ایک اونٹ پڑا تھا اور کچھ کے حصے میں دو اور باقی کے حصے میں کھالیں (ملاحظہ ہو صد۱۳ پیراگراف ۲) تعجب اس پر ہے کہ یہ جملہ خود ناقد محترم نے بھی وادین میں نقل کیا ہے۔ کیا یہ بدیہی بات عقل سلیم و ذہن رسا کے لئے کافی نہ تھی کہ اونٹوں کے علاوہ "کچھ اور" بھی مال غنیمت ملا تھا۔ اور "یہ کچھ اور" ہتھیاروں، مویشیوں (اونٹ کے علاوہ) اسباب روزمرہ اور سامان تجارت پر مشتمل تھا جیسا کہ صد۱۳ پر اسی پیراگراف میں ان کا اور ان سے متعلق تفصیلات کا ذکر ہے۔ صفحہ ۱۳ اور صفحہ ۱۴ کے دونوں پیراگرافوں کو ملا کر پڑھنے سے ایک ذہین قاری یہ بخوبی سمجھ لے گا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حاصل شدہ مال غنیمت کا ایک مالی تخمینہ لگایا تھا اور پھر اس کو تین سو چھبیس حصوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا تھا جو روایت کے مطابق دو اونٹوں (عام قسم کے) کی قیمت کے برابر تھا اور یہ قیمت اس عہد کے نرخوں کے مطابق اسّی درہم (لگ بھگ) پہنچتی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک تو اونٹوں کے علاوہ تمام دوسرے مال غنیمت کو نظر انداز کر دیا اور دوسرے یہ کہ ایک معیاری حصہ اور اس کی قیمت کی جو بات کہی گئی ہے اس پر بھی دھیان نہیں دیا۔ اس سے بڑی ستم ظریفی یہ کی کہ انھوں نے مجاہدین بدر کی تین سو تیرہ تعداد میں سے ہر ایک کو ایک اونٹ دلایا۔ دراصل یہ تنقید ریاضی کے اصولوں کے سانچے میں تاریخی حقائق و نتائج کو بلا سوچے سمجھے ڈھالنے کے مترادف ہے۔

(۲) اگرچہ اوپر کی بحث سے ڈاکٹر صاحب کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ صد۱۳ کے پہلے جملہ اور صد۱۴ کے دوسرے پیراگراف کے پانچویں اور چھٹے جملوں میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ تاہم مختصراً اس

ضمن میں مزید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ چوبیس ہزار درہم کی مجموعی رقم یقینی طور پر کافی بڑی تھی لیکن انفرادی حصہ اسّی درہم بہت حقیر تھا۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ کس کو کتنا ملا یا مجموعی میزان کیا تھا؟ مطلوب تو اموال غنیمت کا معیشت میں حصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ تین سو تیرہ مسلم مجاہدین فی کس اسّی درہم کی رقم پانے کے بعد کتنے مالدار ہوئے ہوں گے؟ ڈاکٹر صاحب نے جو مناسبت ان دونوں عبارتوں کے درمیان دیکھنی چاہی ہے اس کی وضاحت نہیں کی۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان کے منشا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کے مطابق وضاحت کی ہے۔ اگر وہ "مناسبتِ مطلوبہ" کی تصریح کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ اسی مناسبت سے کوئی بات عرض کی جا سکتی تھی۔

(۳) ص۱۲ کی تیسری سطر میں جس مجموعی رقم کا ذکر ہے وہ غزوۂ بنی قریظہ میں شریک مسلم مجاہدین کے کل حصوں کو ۱۵ دینار کے ضرب کے اصول سے نکالی گئی ہے۔ اور پھر اس میں خمس اور صفی کی تخمینی قیمت کو جوڑ دیا گیا ہے مشق کے طور پر ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ سادہ سی ضرب دے کر اور جوڑ لگا کر ریاضی کا اصول معلوم کر سکتے ہیں اور مجموعہ یہ نہ آئے تو خادم کو بھی مطلع فرمائیں بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب غلطیوں کی واضح نشاندہی فرماتے کہ یہاں کیا ہونا چاہئے تھا۔

(۴) چوتھا اعتراض فاضل تنقید نگار نے غزوہ حنین کے مال غنیمت میں حاصل شدہ اونٹوں اور بکریوں کی مجموعی تعداد اور مسلم مجاہدین کی کل تعداد پر ان کی فی کس تقسیم پر کیا ہے۔ یہ اعتراض بعینہ ویسا ہی ہے جیسا کہ انھوں نے غزوۂ بدر کے ضمن میں کیا ہے۔ غزوہ حنین کے ضمن میں فاضل ریاضی داں نے چار ہزار اوقیہ چاندی (تقریباً ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم) کی نقد رقم نظر انداز کر دی ہے۔ آخر وہ بھی تو مجاہدین میں تقسیم ہوئی تھی۔ انھوں نے یہاں بھی بارہ اونٹوں یا ان کی متبادل ایک سو بیس بھیڑ بکریوں کو ہر مجاہد حنین کا حصہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک معیاری حصہ تھا یعنی یا تو ایک سپاہی کو بارہ اونٹ ملے تھے یا ایک سو بیس بھیڑ بکری یا ان کے مساوی رقم یا اسباب مشکل یہ ہے کہ تنقید نگار محترم معیاری حصہ کو فی کس حصہ سمجھ کر مجاہدین کی کل تعداد پر برابر سے ضرب کر دیتے ہیں اور ستم ظریفی یہ کرتے ہیں کہ جانوروں ہی پر نظر رکھتے ہیں اور بقیہ اسباب و نقد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

رخصت سے پہلے میں یہ اعتراف کر لوں کہ میں ریاضی کے اصول و قواعد تو درکنار سادہ حساب کتاب میں بھی کافی کمزور ہوں اور تاریخی حقائق یا سیرت نبوی کی تفصیلات پر مکمل دسترس کا بھی مدعی نہیں ہوں لہٰذا اس مضمون میں یا دوسرے مضامین میں خاکسار سے غلطیاں ممکن ہیں۔ لہٰذا قارئین کرام سے التماس ہے کہ مجھ کو ان سے ضرور مطلع فرمائیں اس کے ساتھ یہ درخواست کرنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ تنقید سنجیدہ اور علمی ہونی چاہئے ورنہ نفس موضوع کے بارے میں غیر ضروری شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اور عام قارئین کا اعتماد متزلزل ہوتا ہے۔ یہ جواب بھی محض جواب کی خاطر نہیں بلکہ اس غلط تاثر سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے استدراک سے ایک عام قاری کے ذہن پر پڑ سکتا ہے۔ ویسے میں ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس امر کی طرف ضرور متوجہ کر دیا ہے کہ بات زیادہ سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ کہنی چاہئے اور تصریحات کو بھی مزید کھول دینا چاہئے۔ مگر اس میں ہمارے مدیران گرامی کی یہ قدغن حائل ہے کہ مضمون مختصر، بات کم اور معانی زیادہ ہوں۔ ●●

(محمد یٰسین مظہر صدیقی)

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تازہ تقریروں کے مجموعے

(۱) تحفۂ کشمیر (۲) تحفۂ دکن

مولانا مدظلہ نے اندرون ملک جن شہروں اور بیرون ملک جن ممالک کا دورہ کیا، وہاں انھوں نے وہاں کے مخصوص حالات اور مسائل کو سامنے رکھ کر اپنے تاریخی مطالعہ کا نچوڑ، قرآن سے استفادہ کا لب لباب، اور اپنا درد دل رکھا، اندرون ملک خاص طور پر قرب مکانی، مسائل و مشکلات، مقرر کی ذاتی واقفیت اور عمر و تجربہ کی پختگی کی بنا پر ان تقریروں میں بعض ایسے حقائق و مضامین آگئے ہیں جو نہ صرف ان مقامات کے باشندوں کیلئے بلکہ بیشتر اسلامی ممالک کے اہل فکر و نظر کے لئے لائق توجہ اور مستحق غور و فکر ہیں، اس سلسلے کے حسب ذیل دو تازہ مجموعے پیش ہیں۔

تحفۂ کشمیر

ان تقاریر و خطابات کا مجموعہ جو ۲۹ اکتوبر اور ۴ نومبر ۱۹۸۱ء کے درمیان سرینگر کشمیر کے مختلف اجتماعات اور تقریبات کے موقعوں پر کئے گئے۔ کتابت و طباعت آفسٹ معیاری، جلد، قیمت ۷ روپئے۔

تحفۂ دکن

حیدرآباد و اورنگ آباد کے مختلف اجتماعات و مجالس (منعقدہ ۱۱ تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء) کی وہ تقریریں جن میں دینی و علمی رہنمائی، ایک داعی دین اور باخبر و صاحب فکر عالم کے نقطۂ نظر سے حالات حاضرہ کا جائزہ، اور ملت اسلامی ہند کے باشعور اور ذمہ دار طبقہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کی نشاندہی۔ معیاری کتابت آفسٹ طباعت، قیمت ۶ روپئے۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۹۹ - لکھنؤ